پروفیسر نورالحسن ہاشمی کی علمی خدمات

ڈاکٹر پروین شجاعت کے تحقیقی مقالے کی روشنی میں

رشید قریشی

زہرا منزل، B-215، ہاؤسنگ بورڈ کالونی، کرود، بھوپال، موبائل: 9755913370

یوپی کے ضلع ہردوئی میں دو قصبے تعلیم کے لیے مشہور ہیں ایک سندیلہ، دوسرا بلگرام۔ سندیلہ وہ جگہ ہے جہاں صوفیاء کرام نے علم کے چراغ روشن کئے۔ ان کی تعلیم کا مقصد طہارت قلب ہے تاکہ اپنے رب سے قریب تر ہو جائیں۔ ان کا خاصہ گوشہ نشینی نہیں فعال زندگی ہے۔ کوشش یہی ہوتی ہے کہ معاشرہ میں امن و آشتی اور خیر سگالی کا ماحول قائم کریں۔ سندیلہ کے رہنے والوں نے علمی تحریک اور دینی تعلیم دونوں کو سمجھا۔ اپنے بچوں کو جدید تعلیم کے لیے دور دور کے اسکولوں میں داخل کرایا۔ جن ہستیوں نے تعلیم کے ذریعہ بلند مقام حاصل کیا ان میں ایک ہستی پروفیسر نورالحسن ہاشمی کی ہے۔ ڈاکٹر پروین شجاعت نے جن کا تعلق ایک مشہور ادبی گھرانے سے ہے انھوں نے پروفیسر ہاشمی کی شخصیت کو ایک جملے میں سمیٹا اور لکھا:

''پروفیسر نورالحسن ہاشمی اردو ادب کی ایک مختلف الجہات اور جامع الصفات شخصیت ہیں۔''

اس جملے کے لیے ڈاکٹر پروین نے جب صراحتی پیرایہ اختیار کیا تو وہ پی۔ایچ۔ڈی۔ کا مقالہ بن گیا۔ مقالہ کا عنوان ہے: ''پروفیسر نورالحسن ہاشمی شخصیت اور ادبی کارنامے'' ڈگری ملنے کے بعد انھوں نے یہ مقالہ کتابی شکل میں شائع کیا۔

ڈاکٹر پروین شجاعت نے مقالے کا آغاز جناب شفاعت علی صدیقی کے ریڈیو فیچر ''یہ بستیاں ہماریاں'' کے ایک اقتباس سے کیا:

شہنشاہ ہند ابوالمظفر شہاب الدین، شاہجہاں کہا کرتے تھے:

''میں اپنی مملکت میں پورب کے قصبات پر فخر کرتا ہوں جہاں کی خاک نے بڑے بڑے فضلا، فقرا، علما اور ارباب دول پیدا کئے ہیں اور جہاں کا ہر قصبہ شیراز کا ہم پلہ ہے۔''

یہ چھوٹا سا اقتباس ہے، لیکن قاری پڑھ کر چونک جاتا ہے۔ اسے کہنا پڑتا ہے شاہجہاں کی علمی بصیرت کی حدیں آفاقی تھیں، جناب شفاعت علی صدیقی کا مطالعہ عمیق اور انداز بیاں دلنشیں ہے۔ اقتباس کا انتخاب اور اسے صحیح جگہ پر پیش کرنا ڈاکٹر پروین کی ژرف نگاہی ہے۔

پروفیسر نورالحسن کی زندگی کے کوائف پیش کرنے سے پہلے آپ نے سندیلہ کی ان ہستیوں کا ذکر کیا جن کی زندگی کا محور دینی، ادبی، تعلیمی اور سیاسی سرگرمیاں تھیں۔ اس طرح مقالہ کا سماجی پس منظر ابھر کر سامنے آجاتا ہے۔

سندیلہ کی ایک بزرگ ہستی مخدوم سید علاء الدین کی ہے جو جغرافیائی حرکت پذیری کرتے ہوئے ملک عجم کے شہر واسط کے قصبے جاجنیر سے ہندوستان آئے۔ بعد میں سندیلہ میں بس گئے۔ ان کا سلسلۂ نسب حضرت علیؓ کرم اللہ وجہہٗ سے ملتا ہے۔ یہی بزرگ ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی کے خاندان کے مورث اعلیٰ ہیں۔

سندیلہ کی ایک ممتاز شخصیت عبدالستار صدیقی کی ہے۔ آپ نے ۱۹۱۲ء میں الٰہ آباد یونیورسٹی سے ایم۔اے۔کیا۔ اس کے بعد یورپ چلے گئے۔ وہاں آپ نے مختلف زبانوں کے کورس مکمل کئے۔ ''۱۹۱۷ء'' میں آپ نے پی۔ایچ۔ڈی۔ کی۔ مقالہ کا عنوان ہے ''قدیم عربی میں دخیل فارسی الفاظ'' جرمنی میں قیام کے دوران انھوں نے پروفیسر باخ سے انگریزی صوتیات کا درس لیا جس سے ان کی تعلیمی زندگی میں نیا رخ آیا۔ جب واپس آئے تو آپ کو ایم۔اے۔او۔ کالج علی گڑھ عربی کا پروفیسر بنایا گیا۔ ہندوستان واپس آکر ممبئی یونیورسٹی کی دعوت پر ''ولسن فلولاجیکل'' خطبے دئے آپ لنگویسٹک سوسائٹی آف انڈیا کے اساسی ممبر بھی تھے۔ مقالات صدیقی کے پہلے حصے میں جو مضامین ہیں انہیں پڑھنے سے انکے دقیق مطالعے اور تاریخی لسانیات سے گہرے تعلق کا اندازہ ہوتا ہے۔ پھر بھی ایک سوال بار بار ذہن میں آتا ہے کہ انھوں نے طلبا کو یہ ترغیب کیوں نہیں دی کہ وہ لسانیات پر توجہ دیں۔ وہ اس پوزیشن میں تھے کہ کئی یونیورسٹیز میں لسانیات کے شعبے قائم کرا سکتے تھے، مگر ان کی کوئی ایسی مساعی نظر نہیں آتی۔ اگر یہ شعبے قائم ہو جاتے تو اردو زبان کو فائدہ پہنچتا۔ لسانی کتابوں کے ترجمے ہوتے، طلبا ریسرچ کرتے، دنیا بھر میں لسانیات

پر جو کام ہوا ہے اس سے واقف ہوتے۔ بنگال اور چنئی میں لسانیات کے تئیں جو دلچسپی ہے وہی دلچسپی ہمارے یہاں ہوتی۔ آج یہ کہنا کہ زبان کی تعلیم میں لسانیات کی اہمیت ہے پرانی بات کو دہرانا ہے۔ اس وقت میرے پیش نظر پروفیسر اقتدار حسین کی کتاب ''صوتیات اور فونیمیات'' ہے جس کا سنہ اشاعت ۱۹۹۴ء ہے۔ اس میں آپ نے لکھا ہے:

''صوتیات کا علم اب اور بھی دوسرے علمی میدانوں میں ضروری سمجھا جاتا ہے مثلاً نفسیات، سماجیات، فلسفہ، بشریات وغیرہ غرض یہ کہ جہاں بھی زبان کا مطالعہ اور تحقیق ہے وہاں وہاں صوتیات کسی نہ کسی شکل میں اہمیت رکھتی ہے۔'' (ص:۱۲/۱۳)

صفحہ ۱۲ پر ہی آپ نے یہ لکھا ہے:

''آج کل یورپ اور امریکہ میں زبان کے استاد کے لیے صوتیات کا علم لازمی قرار دیا گیا ہے''

عبدالستار صدیقی کے علاوہ ایک اور معروف شخصیت جناب غفران فاروقی کی ہے۔ یہ تقسیم ہند کے بعد پاکستان چلے گئے، وہاں انہیں مختلف خدمات کے صلے میں تمغۂ ''ستارہ قائداعظم'' سے نوازا گیا۔ سندیلہ کی اور بھی کئی شخصیات ہیں جنھیں ان کی بے لوث خدمات کی وجہ سے جانا جاتا ہے جیسے مولوی سید مظہر علی نواب التفات رسول، سید اعزاز رسول، ڈاکٹر شجاعت علی، عشرت علی صدیقی، چودھری وجاہت علی، ڈاکٹر سلام سندیلوی، سید شفاعت علی وغیرہ۔ ہم بیگم اعزاز رسول کی خدمت کو بھی فراموش نہیں کر سکتے۔ ان کی جائے پیدائش مالیہ کوٹلہ تھی، مگر وہ سندیلہ کی بہو تھیں۔ آپ کو بہترین پارلیمینٹرین کی حیثیت سے بھی جانا گیا ہے۔

ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی بھی سندیلہ کی نمائندہ علمی شخصیت تھے۔ آپ کی زندگی کے کئی پہلو ہیں جیسے عقیدہ، جدوجہد، ذاتی زندگی کے طور طریق ان باتوں میں ان کے بزرگوں کے اوصاف کی جھلک کے ساتھ عصری تقاضوں کی تفہیم بھی صاف دکھائی دیتی ہے۔ مرحوم کا گراں قدر سرمایہ وہ وقت ہے جو ڈاکٹر عبدالحق، عبدالستار صدیقی، رشید احمد صدیقی، مسعود حسن رضوی، پروفیسر آل احمد سرور، پروفیسر احتشام حسین کے ساتھ گزرا۔ یہ وہ ہستیاں تھیں جنھوں نے وقت کو بدلتے ہوئے دیکھا، اس کی نبض کو پہچانا اور زندگی بھر علمی کاموں میں مصروف رہیں۔ ان کی ذہنی آبیاری کا ایک اور سرچشمہ تھا جسے خود کار توانائی کہہ سکتے ہیں۔ اس توانائی کا اظہار اس وقت ہوتا ہے جب انسان غیر معمولی کشمکش، آزمائش یا تقاضوں کے روبرو ہو اس وقت اس کی تمام تر صلاحیتیں مجتمع ہو جاتی ہیں پھر ایک نئی توانائی ابھرتی ہے۔ یہ حالات اس وقت پیش آئے جب وہ ''دلی کا دبستان شاعری'' کے موضوع پر پی۔ ایچ۔ ڈی کر رہے تھے۔ یہی صورت اس وقت پیش آئی جب وہ کلّیات ولی کو ترتیب نو دے رہے تھے۔ بہرحال یہ دونوں مراحل کامیابی سے اختتام پذیر ہوئے۔

ڈاکٹر پروین شجاعت نے ''دلی کا دبستان شاعری'' کے بارے میں لکھا ہے کہ ''یہ مقالہ ادبی و تحقیقی دنیا میں بے حد مقبول ہوا۔ اس کی افادیت واہمیت کو مشاہیر نے تسلیم کیا ہے۔'' دبستان فارسی زبان کا ایک لفظ ہے اردو میں اس مفہوم کے لیے اسکول، مدرسہ، مکتب وغیرہ الفاظ مستعمل ہیں اسے علمی آماجگاہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ اسکول یا دبستان کو اس طور پر بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ ایک مخصوص وقت اور مخصوص علاقہ میں ایسے مصور، سنگ تراش، معمار، موسیقار جن کے فن میں مماثلت ہو یا ایسے ادیب، شاعر، دانشور، سیاسی وسماجی رہنما جن کی فکر میں یکسانیت کا رنگ ہو یا وہ طلبا جن کا تعلق نظریاتی تعلیمی ادارہ سے ہو ان کے عقائد اور اصولوں میں مشابہت پائی جائے تو ان کے مشترکہ طریقۂ اختیار کی بنیاد پر ان سب کو ایک دبستان سے وابستہ سمجھا جا سکتا ہے۔ دبستان کسی دباؤ کے تحت نہیں بلکہ از خود اثر قبول کرنے سے قائم ہوتے ہیں۔

جناب عبدالسلام ندوی نے اپنی کتاب شعرالہند کے اول حصہ میں جب قدما کے تیسرے دور کا جائزہ لیا تو ان کے تنقیدی ذہن نے لکھنؤ کے شعرا کو ایک اسکول میں سمیٹ لیا۔ پھر اپنی بات سمجھانے اور اس بات میں وزن پیدا کرنے کیلیے آپ نے شاعری کا دلّی اسکول قائم کیا اور دونوں اسکولوں کے فرق کو واضح کیا اور لکھا:

''لکھنؤ کی شاعری کا خاکہ اگرچہ مصحفی اور انشاء ہی کے زمانہ میں قائم ہو چکا تھا تاہم اب تک شاعری کے دو مختلف اسکول قائم نہیں ہوئے تھے، لیکن ناسخ اور آتش نے اس رنگ کو زیادہ نمایاں کیا اس لیے ان کے زمانے سے لکھنؤ اور دلی کے دو مختلف اسکول قائم ہو گئے جن کی خصوصیات باہم مختلف قرار پائیں۔''

''دلّی اور لکھنؤ کے اس اختلاف کے ساتھ شیخ ناسخ اور خواجہ آتش نے بھی الگ الگ رنگ اختیار کئے اس لیے خود لکھنؤ میں بھی شاعری کے دو مختلف اسکول قائم ہوئے اور ان دونوں کے مقابلہ اور موازنہ کا مسئلہ اردو شاعری کی تاریخ کا معرکۃ الآراء مسئلہ بن گیا۔''

عبدالسلام ندوی لکھنوی شاعری کا رنگ شاہ نصیر، ذوق اور مومن کے یہاں بھی دیکھتے ہیں پھر کیا دہلی کی شاعری میں بھی دو اسکول ہو گئے؟

کہا جاتا ہے کہ شاہ عالم کے دور میں جب دہلی کے حالات ناگفتہ بہ

ہوئے تو وہاں کے کچھ شاعر لکھنؤ چلے گئے۔ اس وقت لکھنؤ کے حالات ایسے تھے جیسے وہاں تادیبی وسیلے گم ہوگئے یا کمزور پڑ گئے ہوں۔ ایک ذہنی استحصال کی روتھی جس کی دبش میں دہلی کے شعرا تھے درباری استحصال کے تدریجی اثرات ان کی شاعری میں ہیں، لیکن ابتذال اور فحاشی سے انھوں نے خود کو بچائے رکھا۔ آتش اور ناسخ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ انھوں نے لکھنؤ اسکول کی بنیاد رکھی، لیکن وہ دونوں شاعر ابتذال اور بے حیائی سے دور رہے۔ ناقدین نے تسلیم کیا ہے کہ آتش کے یہاں داخلیت اور خارجیت کا امتزاج تھا۔ ان کے کلام میں تصوف بھی ہے۔ ناسخ اپنے وقت کے بلند پایہ شاعر تھے۔ یہ صحیح ہے کہ ان کے دور کی شاعری میں عفونت تھی، لیکن اس کے ذمہ دار ناسخ نہیں بلکہ استحصال گزیدہ معاشرہ تھا۔ ان کی شاعری اعلیٰ تشبیہات واستعارات کا مجموعہ تھی۔ اردو ادب کے تئیں ان کی خدمات تاریخی ہیں۔ جناب عبدالسلام نے کچھ اصلاحات کا ذکر کیا ہے:

(i) پہلے غزل کے لیے ریختہ مروّج تھا جسے انھوں نے ترک کر دیا۔
(ii) فحش الفاظ کا استعمال ختم کیا گیا۔
(iii) الفاظ کی تذکیر وتانیث کے قاعدے بنائے۔
(iv) غزل میں ہمہ گیریت پیدا کی۔ زندگی کے سارے مسائل غزل کا موضوع بن گئے۔
(v) لکھنؤ میں پہلے زبان اردو کے لیے لفظ ریختہ مروّج تھا ناسخ نے بھی اردو کو ریختہ لکھا، لیکن بعد میں صرف اردو لکھتے رہے دہلی میں اس وقت غالب لکھ رہے تھے۔

ریختہ کے تم ہی استاد نہیں ہو غالبؔ

ہمارے ملک کے آئین میں آٹھواں شیڈول قومی زبانوں سے متعلق ہے اسی شیڈول میں دوسری قومی زبان کے ساتھ اردو بھی قومی زبان کی حیثیت سے درج فہرست ہے۔ اس تاریخی سچائی کا انتساب ناسخ کے نام۔

ریختہ سے پہلے بھی اردو کے کئی نام رہے ہیں۔ ایک ذہن ہے جو اردو زبان کا مخالف ہے وہ اردو کے پرانے ناموں کو تسلیم نہیں کرتا اس کا کہنا ہے کہ اردو کا لفظ مصحفی اور ناسخ کے زمانہ کا ہے یہی اردو کا شروعاتی دور ہے۔ یہ غلط خیال اردو کی ارتقائی منزلوں کو نظر انداز کرتا ہے۔

پروفیسر ابو محمد سحر کی ایک کتاب ''ہندی/ ہندوی پر ایک نظر اور دوسرے مضامین'' ہے۔ اس کتاب میں آپ کا تحریر کردہ ایک مقالہ ہے۔ ''ہندی/ ہندوی پر ایک نظر''۔ جو آپ نے منشی پریم چندر کے صاحبزادے ڈاکٹر امرت رائے کی کتاب

"A House Divided--- The Origion and Development of Hindi/Hindvi"

کے جواب میں لکھا ہے۔ اسے پڑھ کر امرت رائے صاحب کا مطمح نظر ظاہر ہوتا ہے جس کی خاطر انھوں نے یہ کتاب لکھی۔ اس کتاب کا مرکزی خیال ہے ہندوستان میں مسلمان کی آمد کے پانچ چھ سو سال کے بعد تک جو زبان شمالی ہند اور دکن میں بولی جاتی تھی وہ ہندی/ ہندوی تھی۔ اس زبان میں زیادہ تر الفاظ سنسکرت کے تھے۔ ۱۷ویں صدی کے آخری دور میں ہندی/ ہندوی میں عربی وفارسی کے الفاظ بڑی تعداد میں شامل کئے گئے۔ جس کی وجہ سے یہ نئی زبان بن گئی۔

امرت رائے صاحب سے اختلاف کرتے ہوئے ڈاکٹر ابو محمد سحر نے تحریر کیا ہے کہ امرت رائے صدیوں کے مربوط مآخذ کو بدلنا چاہتے ہیں، انہیں یہ گوارہ نہیں کہ اردو تاریخی اعتبار سے ہندی کے مقابلے میں کئی سو سال زیادہ قدیم زبان تسلیم کی جاتی ہے۔ لفظ ''ہندی'' عربی وفارسی زبان کا لفظ ہے۔ یہ لفظ ملک کے نام کے لیے استعمال کیا گیا اور اس کی زبانوں کے لیے بھی استعمال کیا گیا جس میں دکنی اور دوسری زبانیں شامل ہیں۔ امرت رائے کا یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ اختتام ۱۷ویں صدی سے ہندی/ ہندوی میں عربی وفارسی کا غلبہ شروع ہوا۔ نظامی کی مثنوی کدم راؤ پدم راؤ میں عربی وفارسی کے اثرات ہیں۔ محمد قلی قطب شاہ اور ولی کی لفظیات، تلمیحات اور تشبیہات میں بھی فارسی کا اثر نمایاں ہے۔ امرت رائے کی یہ دلیل کہ دکنی ادب کے لیے اردو کا لفظ استعمال نہیں ہوا بے وزن ہے۔ شروع میں شمالی ہند میں بھی اردو زبان کے لیے اردو کا لفظ استعمال نہیں ہوا۔ تاریخ فرشتہ اور بادشاہ نامے میں اسے ہندوستان اور وجہی کی سب رس میں زبان ہندوستان لکھا گیا ہے۔ ہندوستان اور زبان ہندوستان سے مراد دہلوی زبان ہے۔ دہلوی دہلی کے آس پاس کے رابطے کی زبان تھی۔ دکن میں ہندی، ہندوستانی، زبان ہندوستان، دکنی، گوجری، ریختہ جس زبان کو کہا گیا ہے یہ اردو کے پرانے نام ہیں۔ شمالی ہند میں اردو کے نام ہیں۔ ہندی/ ہندوی، زبان دہلوی، ریختہ، زبان اردوئے معلیٰ، اردوئے معلّی شاہجہاں آباد، اردو معلّی، سب سے بعد میں اردو نام مروج ہوا۔

شعرالہند کی اشاعت کے بعد لکھنؤ کا جاگیردارانہ معاشرہ پوری طرح واشگاف ہوا۔ شاعری میں تطہیری عمل ناسخ اور آتش کے زمانے سے شروع ہو چکا تھا۔ جناب عبدالسلام ندوی نے لکھا کہ شیخ ناسخ اور خواجہ آتش کے

بعد اردو زبان اور شاعری میں جو کمی رہ گئی تھی اس کو ان کے تلامذہ نے نہایت جامعیت کے ساتھ پورا کیا۔ آپ نے مزید لکھا کہ آغا حجو شرف جو آتش کے شاگرد تھے انھوں نے تمام الفاظ اور مضامین کو متروک قرار دیا جو شریعت، تہذیب، اخلاق اور انسانیت کے خلاف تھے۔ بعد کی نسل نئی تعلیم سے آراستہ تھی۔ یقیناً اس نے مغربی مفکرین خاص طور سے روسو، مارکس، برطانیہ کے سوشلسٹ اسکول اور انقلاب روس کو پڑھا اور سمجھا ہوگا۔ ان کے ذہنوں میں لکھنوی شاعری کا مواخذہ بھی محفوظ تھا۔ ان عوامل کے امتزاج سے ان کے ذہن و دماغ میں جو روشنی پیدا ہوئی اس کی کرنوں نے رجحان سے تحریک کا سفر طے کیا۔ اس کا ثبوت بڑی تعداد میں نوجوان ادیبوں کی انجمن ترقی پسند مصنّفین میں شمولیت تھی۔

شعرالہند کے مابعد اثرات سیاسی منظرنامے میں بھی نظر آتے ہیں۔ نواب، راجے، مہاراجے، جاگیردار، زمیندار یہ سب استحصالی کارندے تھے۔ اس نظام کی برائیوں کے نتائج ظاہر کرنا اس کے خاتمے کا محضر نامہ تیار کرنا ہے جسے شعرالہند نے انجام دیا۔ ۱۵/اگست ۱۹۴۷ء سے پہلے ہی شہزادوں کی سیاسی طاقت سلب کر لی گئی تھی جب انھوں نے انڈین یونین میں شمولیت کی دستاویز پر دستخط کئے تھے۔ آزادی کے بعد جلد ہی قانون کے ذریعہ جاگیرداری، زمینداری نظام کا خاتمہ ہوا۔ اندرا گاندھی نے جب رؤسا کا صرف شاہی سوخت کیا تو ان کی قوت پرواز ختم ہوگئی۔ آزادی کے بعد سیاسی افق پر جو کچھ ہوا اس سے استحصالی قوتوں پر ضرب لگی، لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اس کی بار یابی اب معاشرہ کے رگ وریشہ تک ہو چکی ہے۔ دنیا میں کتنے نظام آئے اسے ختم کرنے کے لیے اگر کبھی کنٹرول ہوا تو وہ وقتی کنٹرول تھا پھر کسی نہ کسی شکل میں ظاہر ہوگیا۔ اب ایک تجربہ باقی ہے State less society کے قیام کا۔ پہلا سوال ہے کہ کیا اس سوسائٹی کا وجود ممکن ہے؟ دوسرا سوال ہے کہ اگر استحصال وہاں بھی باقی رہا تو پھر کون سا نظام آئے گا؟

جب عبدالسلام ندوی نے شاعری کے دو اسکول قائم کئے تو علمی حلقوں میں غور وفکر کی ایک لہر پیدا ہوئی۔ علی گڑھ میں دو تحقیقی مقالے تحریر کیے گئے۔ ایک ہے ''دلی کا دبستان شاعری'' یہ موضوع نورالحسن ہاشمی کے مقالے کا ہے۔ دوسرا مقالہ جناب ابواللیث صدیقی نے ''لکھنؤ کا دبستان شاعری'' کے عنوان سے تحریر کیا۔ دونوں مقالے پروفیسر آل احمد سرورؔ کی نگرانی میں لکھے گئے۔ ریسرچ اسکالرس کو یونیورسٹی نے پی۔ ایچ۔ ڈی۔ کی ڈگری سے سرفراز کیا۔ سرورؔ صاحب نے ان مقالوں کے عنوان میں لفظی تبدیلی کی۔ ان کے تجویز کردہ مقالوں میں اسکول کے بجائے دبستان لکھا گیا۔ دبستان ایک پرکشش لفظ ہے۔ ہم جب دبستان کہتے ہیں تو غیر شعوری طور سے اس کے ہمدم گلستان اور بوستان ہمارے ذہن میں مرتسم ہوکر دبستان کی پہنائیوں میں اضافہ کر دیتے ہیں۔

نورالحسن ہاشمی نے ''دہلی کا دبستانِ شاعری'' کی شروعات اختتامِ عہد عالمگیری سے کی ہے۔ شعرالہند میں عبدالسلام ندوی نے لکھا ہے کہ لکھنوی شاعری کا خاکہ مصحفیؔ اور انشاؔ کے زمانے میں قائم ہوا۔ ان دونوں زمانوں میں طویل دوری ہے اس لیے لکھنؤ اور دلّی کی شاعری کا موازنہ مشکل ہے۔ اگر ہمیں دلّی اور لکھنؤ کی شاعری کا موازنہ کرنا ہے تو مصحفیؔ اور انشاؔ کے عہد کا زمانہ منتخب کرنا پڑے گا۔ یہی زمانہ دلّی کی شاعری کا ہونا چاہیے۔ ہاں اگر موازنہ مقصد نہیں صرف یک طرفہ شاعری کے رجحان کا جائزہ لینا ہے تو محقق جس مدت کو مناسب سمجھے اُس کا تعین کرسکتا ہے۔

جب لکھنؤ اور دلّی کے دبستانِ شاعری قائم ہوئے تو شاعری کے دوسرے مراکز کو بھی دبستان کا نام دیا گیا جیسے اردو شعرا کا دبستانِ رامپور، اردو شعرا کا دبستانِ پٹنہ۔ ایس۔ ایم۔ جعفری نے اپنی کتاب ''تعلیم ہندوستان کے مسلم عہدِ حکومت میں''۔ ان دونوں دبستانوں کا ذکر خدابخش کے مضمون اردو لٹریچر کے حوالے سے کیا ہے۔ آپ کا یہ مضمون مسلم یونیورسٹی جنرل ۱۹۳۱ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔ خدابخش صاحب نے لکھا ہے کہ لکھنؤ اُجڑنے کے بعد جو شاعر رامپور گئے اُنھوں نے مبالغہ اور متروک الفاظ کو شاعری سے خارج کر دیا۔ اِس شاعری کے سب سے بڑے ترجمان مرزا داغؔ تھے۔ آپ نے مکتبِ پٹنہ کے دو شاعر فطرتؔ اور راسخؔ کے بارے میں لکھا ہے کہ اُنھیں خاص شہرت حاصل ہوئی۔

کلّیات ولیؔ کی تدوین نو ڈاکٹر نورالحسن کی ایک عالمانہ کاوش ہے۔ لکھنؤ یونیورسٹی نے اس تحقیقی کام کے لیے آپ کو ڈی لٹ کی ڈگری سے نوازا۔

کلیات ولیؔ کی پہلی تدوین احسن مارہروی نے کی تھی۔ نسخ میں جو اختلاف تھے انھیں بھی آپ نے ظاہر کئے تھے، لیکن ایسے اختلافات کی تعداد کثیر تھی جن کا حوالہ اس ایڈیشن میں نہیں تھا۔ مولوی عبدالحق اختلافات کی تعداد سے پریشان ہوگئے۔ انھوں نے چاہا کہ ولیؔ کے کلام کی تصحیح اور ترتیب نو ہو۔ اس کام کے لیے انھوں نے ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی صاحب کو منتخب کیا۔ جس قدر نسخ انجمن کی تحویل میں تھے وہ سب ہاشمی صاحب کو دے دیے۔ اس مشکل ترین کام کے لیے ہاشمی صاحب کا انتخاب آپ نے غور وخوض کے بعد ہی کیا ہوگا۔ وہ انگریزی اور اردو میں ایم۔ اے۔ تھے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی۔ کا مقالہ پروفیسر آل احمد سرور کی نگرانی

میں لکھ چکے تھے۔اس کے علاوہ اور بھی خوبیاں تھیں جیسے مستقل مزاجی، منصفانہ ذہن اور نکتہ رسی یہ جوہر اس وقت ظاہر ہوئے جب آپ تدوین کے ابتدائی مراحل میں تھے اور خلفشار انتہا تک پہنچ گیا تھا۔کلیات ولی کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

''جب مقالہ اور تصحیح کا کام کرنے بیٹھا تو خدا یاد آ گیا۔ایک ایک لفظ کے پیچھے پریشان رہتا کہ کیا صحیح ہے کیوں صحیح ہے، کون سی غزل ولی کی ہوسکتی ہے کون سی نہیں، نسخوں، غزلوں کی تعداد اور تقریباً ہر غزل کے اشعار میں اتنے اختلافات تھے کہ جان ضیق میں آ گئی۔''

مجبور ہوکر اس کیفیت سے ڈاکٹر عبدالحق کو آگاہ کیا۔انھوں نے جواب دیا کہ عبدالستار صدیقی سے رہبری حاصل کریں۔ ہاشمی صاحب نے مشورے پر عمل کیا۔عبدالستار صدیقی صاحب اس وقت الہٰ آباد میں تھے۔ ہاشمی صاحب اپنی دشواریاں خط میں لکھتے، جواب میں انہیں ماہرانہ رہبری ملی۔ اس طرح الجھنوں کا مداوا ہوگیا۔ اگر ہم یہ سمجھیں کہ ہاشمی صاحب کی مشکلات کا مداوا عبدالستار صدیقی نے کیا تو یہ جزوی سچائی ہوگی۔مکمل سچائی اس وقت ظاہر ہوگی جب ہم یہ کہیں کہ ہاشمی صاحب کی دشواریوں کا مداوا ماہر لسانیات عبدالستار صدیقی نے کیا۔

مطبوعہ کلیات تو نظر سے نہیں گزری لیکن مقالات صدیقی (پہلا حصہ ترتیب مسلم صدیقی) میں ایک مقالہ ''ولی کی زبان'' کے فٹ نوٹ میں درج ہے ''دیباچہ کلیات ولی جدید''، یہ ایک علمی مقالہ ہے ولی کی زبان کو سمجھنے میں اس کی حیثیت سنگ میل کی ہے۔آپ نے لکھا ہے:

''ولی کی زبان کو لوگ عموماً دکنی کہتے ہیں اس لیے یہ دیکھ لینا چاہئے کہ دکنی (یا دکھنی) زبان جب وجود میں آئی اس نے کیا مدارج طے کئے اور کیا صورتیں اختیار کیں اور ولی کی زبان کو اس سے کہاں تک واسطہ ہے۔''

اس مقالے کو پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ۹۰۷ھ میں علاؤالدین نے دیوگیر پر قبضہ کیا تو یہ علاقہ دکن میں دہلی سلطنت کا ایک مرکز بنا۔اس طرح دہلی اور دکن کے درمیان ایک تمدنی رشتہ قائم ہوا۔۷۲۷ھ میں محمد تغلق نے دیوگیر کو پایہ تخت بنایا تو بڑی تعداد میں زندگی کے ہر شعبہ کے افراد دہلی سے دیوگیر منتقل ہوگئے۔ دیوگیر کا نام دولت آباد رکھا گیا۔اس وقت دولت آباد کو چھوٹا دہلی کہہ سکتے ہیں وہاں کی زبان وہی ہوگی جو زبان دہلی اور اس کے آس پاس کے علاقے میں بولی جاتی تھی۔

ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی کی زندگی کا ایک بڑا حصہ طالب علمی سے عہد معلّمی تک علمی کاوشوں میں گذرا ہے اور وہ زبان وادب کے ذخیرے میں اضافہ کرتے رہے۔ایک اضافہ ''ایک نادر روزنامچہ'' ہے جسے آپ نے کلّیات ولی کی تدوین نو کے بعد مرتب کیا۔ یہ روزنامچہ آپ کے دادا مولوی سید مظہر علی صاحب کا لکھا ہوا ہے۔اس روزنامچے میں ۱۸۶۷ء سے لے کر ۲۴/دسمبر ۱۹۱۱ء تک کے سیاسی و سماجی حالات ہیں جو چھ ہزار فل اسکیپ سائز کے کاغذ پر لکھا ہوا تھا۔اس روزنامچے کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں واقعات کے ساتھ ساتھ دو اخبارات پانیئر اور اودھ پنچ کے حوالے ہیں۔اس روزنامچے کو پڑھنے میں آپ کو چھ ماہ لگے۔ پھر آپ نے اسے مختلف ابواب میں تقسیم کیا۔ یہ روزنامچہ پہلے رسالہ اردو ۱۹۴۶ء میں شائع ہوا بعد میں اسے ادارہ فروغ اردو لکھنؤ نے ۱۹۵۶ء میں کتابی شکل میں شائع کیا۔آخر میں اسے کئی اضافوں کے ساتھ ۱۹۹۰ء میں خدا بخش اورینٹل لائبریری پٹنہ نے مکتبہ جامعہ نئی دہلی سے شائع کرایا۔ یہ روزنامہ اس لیے بھی نادر ہے کہ اس کو پڑھنے سے ۴۵ سال کے واقعات اور اس کے تدریجی نتائج سامنے آتے ہیں۔اس طرح کے روزنامچے اردو یا دوسری زبانوں میں اگر لکھے گئے ہوں تو یقیناً ان کی تعداد بہت کم ہوگی۔

ایک ''نادر روزنامچہ'' کے علاوہ آپ نے کئی پرانی کتابوں کی کھوج کی اور انہیں ترتیب دے کر شائع کرایا جیسے ''کلیات حسرت'' تدوین نو طرز مرصع، ترتیب مثنوی سراپا سوز وغیرہ۔ دراصل یہ اسی نوع کا کام تھا جو کام بابائے اردو دکن میں کر چکے تھے۔ ہاشمی صاحب نے طلبا کی درسی ضروریات کو پیش نظر رکھتے ہوئے اور کئی کتابیں مرتب کیں جیسے ریختہ ولی، ریختہ غالب۔آپ کی ایک اور حیثیت مؤلف لغات کی بھی ہے۔

ہاشمی صاحب کی کتاب ''ادب کیا ہے؟'' اس میں وہ مضامین ہیں جو آپ نے مختلف اوقات میں ریڈیو اسٹیشن پر پڑھے۔ بعد میں انہیں کتابی شکل میں شائع کیا۔ یہ ایک صحیح فیصلہ تھا۔اس طرح وہ مضامین محفوظ ہوگئے۔ اب کبھی بھی ان سے استفادہ کیا جاسکتا ہے۔ ریڈیو پر پڑھے جانے والے مضامین کو سننے والے تو بہت ہوسکتے ہیں، لیکن سمجھنے والوں کا حلقہ محدود ہونی ہے۔اگر انہیں غور سے سنا جائے تب بھی حافظے میں محفوظ رکھنا مشکل ہے۔ کوشش یہ ہونا چاہئے کہ زیادہ تر مطبوعہ مضامین پڑھے جائیں۔

اس کتاب میں ایک اور مضمون اصغر گونڈوی سے متعلق ہے جس میں ان کی رجائیت اور شاعری میں شائستہ کلامی کو نمایاں کیا گیا ہے۔ دوسرے مضمون میں شبلی نعمانی، الطاف حسین حالی اور محمد حسین آزاد کے نثری اسلوب بیان کا جائزہ ہے۔ اقبال کی شاعری پر دو مضامین ہیں۔ ہاشمی صاحب کی دوسری تنقیدی کتاب ہے ''ادب کا مقصد'' اس کتاب میں ان

مضامین کا انتخاب ہے جو ۱۹۳۹ء سے ۱۹۵۶ء کے درمیان لکھے گئے۔

پروفیسر نورالحسن کی ایک اور کتاب ہے ''ناول کیا ہے؟'' اس کتاب میں ڈاکٹر محمد احسن فاروقی کا اشتراک قلم ہے۔ داستان اور مختصر افسانوں کے درمیان کا جو زمانہ ہے اس میں طویل افسانوی صنف کا آغاز ہوا، جسے ناول کہا گیا۔ دنیا کے دوسرے ملکوں میں ناول کا رواج بہت پہلے سے ہے۔ ناول اس قدر دلچسپ ہوتا ہے کہ ہر فرد جس کا تعلق تعلیمی شعبے سے ہو یا ''بینک کاری'' سے وہ ذوق وشوق سے پڑھتا ہے۔ اب تک اقبال اور غالب کو ان کی اعلیٰ شاعری کے لیے دنیائے ادب خراج تحسین پیش کرتی رہی ہے۔ جب قرۃ العین حیدر کا ناول 'آگ کا دریا' شائع ہوا تو تہلکہ مچ گیا۔ امتیاز سربلندی قرۃ العین کو دیا گیا۔ ان کی اردو ناول کا شمار دنیا کی عظیم ناولوں میں کیا جاتا ہے۔

مقالے کے باب ششم کا عنوان ہے 'پروفیسر نورالحسن بہ حیثیت مترجم'، یہ حقیقت ہے کہ جس زبان میں جتنے اچھے ترجمہ کار ہوں گے اسی اعتبار سے اس زبان کی بہتر نشو ونما ہوگی۔ ترجموں سے مختلف علوم کی آبیاری ہوتی ہے۔ جب تک علوم میں نئے خیالات اور رجحانات کی روش جاری رہتی ہے اس میں نمو کی قوت باقی رہتی ہے۔ اگر یہ سلسلہ رکتا ہے تو افادیت متاثر ہوتی ہے۔ ڈاکٹر پروین نے ڈاکٹر نورالحسن کے ترجموں پر تبصرے سے پہلے ترجموں کے مختلف پہلوؤں پر بہت کچھ لکھا ہے اسے ہم بسیط مضمون کہہ سکتے ہیں۔ آپ نے لکھا ہے کہ ترجموں کے ذریعے دوسرے ممالک کی تہذیب، ثقافت، ادبی تخلیقات، سیاسیاتی نظریات اور سائنسی مزاج کو بہتر طور پر جان اور سمجھ سکتے ہیں۔

نورالحسن ہاشمی نے دو انگریزی کی کتابوں کے ترجمے کئے ان ترجموں کی اہمیت اس لیے ہے کہ یہ دوران تعلیم کئے گئے۔ ۱۹۳۷ء میں آپ نے اردو میں ایم.اے. کے واسطے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں داخلہ لیا وہاں آپ نے ڈاکٹر ہیرن شا کی کتاب The Development of Political Ideas کا ترجمہ ''سیاسی نظریے'' کے عنوان سے کیا۔ دوسرا ترجمہ جارج برنارڈ شا کی کتاب Candida کا ہے۔ اردو ترجمے میں اس کا نام ''بھید'' ہے۔ یہ ترجمے ایک لحاظ سے علمی خدمات ہیں۔ ان ترجموں سے خود ان کی علمی استعداد میں اضافہ ہوا ہوگا۔

ڈاکٹر ہیرن شا کی کتاب کا ترجمہ جس دور میں ہوا اُس دور میں اور اس کے بعد کے دور میں اِس موضوع پر اردو میں معیاری کتابیں تصنیف ہوئیں۔ ڈاکٹر پروین نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ ہاشمی صاحب چاہتے تھے کہ ان کا ترجمہ مکتبہ جامعہ سے شائع ہو جائے مگر مکتبے نے کوئی جواب نہیں دیا شاید اس کی وجہ یہ ہوئی کہ ان ہی دنوں سیاست کے موضوع پر پروفیسر محمد مجیب کی ایک ضخیم کتاب ہندوستانی اکیدمی الٰہ آباد سے شائع ہوئی تھی۔ ڈاکٹر پروین نے کتاب کا نام نہیں لکھا، مگر یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ اس کتاب کا نام ''تاریخ فلسفہ سیاسیات'' ہے۔ اس عنوان سے لکھی ہوئی محمد مجیب صاحب کی کتاب اگر کہیں اور بھی شائع ہوئی ہو تو اس کا علم نہیں مگر جنوری ۱۹۷۳ء میں اس کتاب کو ترقی اردو بیورو نے نیشنل ٹرسٹ آف انڈیا کے توسط سے شائع کیا تھا۔ میرے پاس اس کتاب کا تیسرا ایڈیشن ہے جسے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے ۱۹۹۹ء میں شائع کیا۔ ''تاریخ فلسفہ سیاسیات'' جناب محمد مجیب کی غیر معمولی کتاب ہے ایسی کتابیں شاذ ہی لکھی جاتی ہیں۔ کتاب کے آخر میں فہرست کتب ہے اسے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے ۹۸ سیاسیات کے مفکرین کی کتابوں سے استفادہ کیا۔ اس کتاب میں ایک باب ہے فلسفہ سیاسیات کی تواریخ اس باب کی تیاری کے مرحلے میں آپ نے دنیا کے ۳۲ عالموں کی کتابوں کا مطالعہ کیا۔ سرفہرست کتاب ہے۔

Hearn Shaw F.J.C. : the Development of Politicial Ideas.

ڈاکٹر پروین نے اپنے مقالے میں ایک منظوم وداعیہ کا ذکر کیا ہے یہ وداعیہ اس موقع پر لکھا گیا تھا جب پروفیسر آل احمد سرور لکھنؤ سے علی گڈھ جارہے تھے۔ لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو سے سرور صاحب کی رفاقت کے طویل ماہ وسال تھے۔ شعبے کے اراکین اور خود سرور صاحب کے لیے جدائی کے مرحلے سے گذرنا آسان نہ تھا۔ اس جدائی کی کیفیت ایسی تھی جیسی کیفیت اس وقت ہوتی ہے جب موسم گل صحن گلستان سے رخصت ہو رہا ہو۔ پھولوں کی خندہ زنی معدوم ہو جاتی ہے، کلیاں کمہلا جاتی ہیں، پتے پتھرا جاتے ہیں اس وقت ان کے ذہنی افق پر ہم نشینی کے ساعات ابھرتے اور ڈوبتے ہیں وہ شدت غم سے خاموش اور ساکت ہو جاتے ہیں جیسے ساز اور آواز کے درمیانی فاصلے بڑھ گئے ہوں۔ موسم گل بھی غم زدہ ہے وہ کوشش کرتا ہے کہ خود پر قابو پائے جب اس قابل ہوتا ہے کہ کچھ کہہ سکے تو کہتا ہے دوستو! دلوں کی قربت پر زماں اور مکاں کی حکمرانی نہیں۔ ہم ملیں گے، پھر ملیں گے اس کے جواب میں ہاشمی صاحب نے کہا:

جاتے ہوئے کہتے ہو کہ آئندہ ملیں گے
ناداں ہے سرور! آپ کی باتوں میں جو آجائے

اس شعر میں رنج وغم کا اظہار تو ہے آخری حصے میں مایوسی ہے۔ یہیں ''الوداعیہ'' کا اختتام ہوتا ہے۔ ○○